مولانا ڈاکٹر غلام محمد

اسلام کا نظامِ روحانی

—— یہ مقالہ مارچ ۸۸ء میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پڑھا گیا ——

الحمد للہ الاحد الواحد القدیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ الافخم سیدنا ومولانا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہ و صحبہ اجمعین — امابعد

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں ایک حقیقتِ امری کی نشاندہی یوں فرمائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ	جب کہ (اے محمدؐ) آپ کے رب نے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ	اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا
اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ج	اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کیا
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰی ج	میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے
شَهِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ	جواب دیا کیوں نہیں، ہم سب گواہ ہیں
الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا	کبھی کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس
غٰفِلِیْنَ ○	سے محض بے خبر تھے!

بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[1] یہ تخم ہدایت کی وہ کاشت تھی جسے کل آسمانی تعلیمات کے مبداء ومنتہا کا وجودِ مجمل کہنا چاہیئے، اس کو عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے عام افراد میں بکھیر دیا گیا تاکہ آئندہ ہر آدمی وحی الٰہی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے

قرآن نے عہد الست کا ذکر کیا ہی اس لئے تاکہ انسان اس کو خوب یاد رکھے، اس کو

---

[1] تفسیری حواشی بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

اپنے راہِ حیات کا چراغ اپنی منزل کا نشان اور اپنے پرکارِ عمل کا مرکز و محور بنائے۔ اس کی یاد تازہ ہے تو عرفانِ نفس بھی حاصل ہے اور عرفانِ رب بھی، اس کی یاد ہمارا ہوش اور اس کی فراموشی ہماری بیہوشی ہے۔ غور کیجئے کہ اسی عہد سے ہمیں پتہ چلا کہ:

۱۔ ہماری اصل یا ہمارا وجود عبارت ہے روح سے۔

۲۔ ہمارا وطن عالم ارواح ہے جو ہماری ناسوتی حیات کی نسبت سے آخرت ہے۔

۳۔ ہماری منزل قربِ الٰہی اور ہمارا آبِ حیات مشاہدۂ ربانی ہے۔

۴۔ ہمارا خمیر عشقِ الٰہی سے اٹھایا گیا ہے (یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ) محبتِ الٰہی کے بغیر ہماری زندگی لفظِ بے معنی اور ذکرِ الٰہی کے بغیر ہمیں چین میسر نہیں آ سکتا (اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)

۵۔ ہمارے سفر کا مبداء و معاد یا مصدر و مرجع اَلَسْتُ و بَلٰی والا نقطہ ہے، یہی اناللہ و انا الیہ راجعون کا حاصل بھی ہے اور عارفِ رومی نے اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگار وصلِ خویش

۶۔ عہدِ الست ہی کے ذریعہ انسان توحید کا دواماً مکلف بنا، اگر یوم الست مکلف نہ بنتا تو اس دنیا میں اگر اس کا مامور بہ توحید رہنا ناممکن ہو جاتا اور ربِ الوہیت کا اقرار نہ ہو سکتا تو دنیوی اعمال پر جزا و سزا بلکہ فی نفسہٖ خیر و شر کی واقعی تمیز تصور سے باہر رہتی۔

مذکورۂ بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جب تک عہدِ الست ہمارے انفرادی و اجتماعی، دنیوی و اخروی اعمال کا مرکز و محور ہے۔ اس وقت تک ہم عبداللہ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہیں اور جہاں اس محور سے ہٹے اور جب تک ہٹے رہے ہم شرف انسانی سے گر کر کہیں کے نہ رہے، کالانعام بل هم اضلّ کا مصداق بن گئے!

؎ ہش دار کہ راہ خود گم نہ کنی

ان حقائق کو سمجھ کر اب آئیے روح کے سفر ناسوتی کا جائزہ لیں۔ انسان اوّل یعنی حضرت

آدم علیہ السلام جب وطن اصلی سے نکل کر اس زمین پر اترآئے چونکہ وہ انسان اول کے ساتھ ساتھ نبیٔ اول بھی تھے، ان کی روح مزکّی اور ان کا قلب مصفّا تھا اس لئے مادی حجابات ان کے لئے شفاف شیشے تھے، وہ مہجورِ وطن ہوکر بھی وطنی لذتوں سے سرشار تھے۔ قربِ الٰہی بھی حاصل تھا اور مکالمۂ ربّانی سے بھی مشرف تھے، مگر ان کی ذرّیت جو پھیلی اور پھیلتی چلی گئی وہ ناسوتی حجابات میں آکر اپنے وطن، وطن کی بہار، اپنی تخلیقی غایت، اپنے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کو یکسر بھلا بیٹھی، علم سے عاری ہوکر جہل میں اور عرفان سے محروم ہوکر فریبِ نظری میں مبتلا ہوگئی۔ آدم زادوں کو ان ظلماتِ عارض سے نکال کر الست کا سبق یاد دلانے اور حقائق الست کو ان پر بے نقاب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہادیانِ حق بھیجے اور بالآخر خاتم النبیین، سردارِ رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایتِ ازلی کے اکمال و اتمام کے لئے مبعوث فرمایا۔ وہ تشریف لائے اور حیات کے دھارے پر آنکھیں بند کئے بہی جانے والی انسانیت کو چونکا دیا، حیات کی اس عارضی موڑ پر جس کا نام دنیا ہے رہنے اور گذر جانے کا ڈھنگ سکھایا، اپنی ذات اور اپنے طرزِ حیات کو گواہ ٹھہرا کر انہیں سفرِ آخرت کا شعور بخشا، فرمایا:

مالی وللدنیا ما انا فی الدنیا	مجھے دنیا (کی لذتوں راحتوں) سے کیا
کراب استظل تحت شجرۃ ثم	سروکار، دنیا میں میری مثال اس سوار مسافر
راح وترکھا	کی سی ہے جو سایۂ شجر میں ستائے اور
	چلتا بنے۔

اور حکماً فرمایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر	دنیوی زندگی تو بس اجنبیانہ اور مسافرانہ
سبیل۔	طور پر بسر کرو!

یہ اپنی طرف سے فرمایا اور اس کے ساتھ الٰہی تنبیہات بھی سنائیں مثلاً فرمایا کہ دیکھو اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا	جس نے ہر اقدام میں، آخرت کی نیت
وھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ	رکھی اور اس کے لئے کوشش کی جیسا

سَعۡیُهُم مَّشۡکُوۡرًا۔ (الاسراء - ۱۹) — کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگوں کی مساعی نگاہِ حق میں قابلِ قدر ٹھہریں گی

غور کیجئے کہ یہی سفرِ آخرت کا ہمہ وقتی شعور ہے جو مسلمان کے زہد، ورع، تقویٰ مصیبت میں صبر، راحت میں شکر، فقر میں شاہی اور شاہی میں فقر و بے نیازی کا ضامن ہے، کیونکہ منزل دوست مسافر کی نظر راستہ کی تکلیف یا راحت پر کب ہوتی ہے، بقول ہمارے شیخ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ:

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

اس مرحلہ پر اس فرقِ منازل کو بھی ذہن میں لائیے کہ انسان یا تو اپنے وطن میں صرف مشاہدۂ ربانی میں مگن تھا یا تاریک دنیا میں آکر " مجاهده " کا پابند کر دیا گیا، امتحان میں ڈالا گیا۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا۔ (الملک - ۲) — اسی نے موت و حیات پیدا کی تا کہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

جہاں روشنی تھی مطالبۂ عمل نہ تھا، جب تاریکی میں گھر گئے تو مجاہدہ واجب ٹھیرا، اب بے بصر و بے خبر انسان منزل کی طرف چلے تو کیوں کر چلے، اس کی اسی ہدایت کے لئے قرآن پاک اتارا گیا جو فرقان ہے کہ حق کو حق باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے، جو نور ہے کہ راہِ آخرت کو روشن کرتا ہے، جو شفا ہے کہ نفس کے روگ کو دور کر کے اس کے ذائقہ کو درست کرتا اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفتِ حق کے قابل بناتا ہے۔ جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت سے بدل دیتا ہے۔ جو ھُدٰی ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولیٰ سے ملا دیتا ہے۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ یہ ربانی نظامِ حیات اور یہ کلام اللہ اترا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر ہی پر تھا، اور وہیں جمع ہو کر جب نطقِ نبوی سے اس کا اظہار انسانیت پر ہوا تو بظاہر انسان کا کان اس کو سن رہا تھا مگر اس کا اثر صرف وہیں ہو رہا تھا

جہاں اثر پذیر دل موجود تھا، خود قرآن کہہ رہا ہے :

لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ	ہراس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو

(ق ۔ ۳۷)

یہ کیوں ؟ اس کا جواب عالم ربّانی علاّمہ ابن قیم یہ دیتے ہیں کہ:

فصاحب القلب الحی بین قلبه وبین معانی القرآن اتم الاتصال	اس لئے کہ زندہ قلب والے کے قلب اور قرآنی معانی میں اتصالِ اتم پایا جاتا ہے ۔

اور فرماتے ہیں کہ یہاں آیتِ پاک میں قلب سے مراد " قلبِ بیدار" ہی ہے نہ کہ دلِ مردہ۔

والمراد به القلب الحی الذی یعقل عن الله ، کما قال الله تعالیٰ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا ــــ ای حی القلب[۹]	اور یہاں قلب سے مراد زندہ قلب ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ، یہ تو خالص نصیحت اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ہے تاکہ ہر اس شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو ــــ یعنی زندہ دل رکھنے والا ہو ۔

معلوم ہوا کہ اصلاً اور آخرکار ہدایت پذیری کا تعلق قلب انسانی سے ہے جو اس دنیا میں روح کی آنکھ اور اس کا حاسۂ ادراک ہے ۔ ثانی طور پر البتہ اسی آیت میں اثر پذیری کی ایک صورت یہ تبلائی گئی ہے :-

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ	یا جو کان دھر کر توجہ سے سنے

(ق ۔ ۳۷)

یہاں کان اور دھیان کو قلب تک ہدایت رسائی کے وسائل قرار دیے گئے ہیں ، باقی حیات اور ہدایت پذیری تمام تر قلب ہی سے متعلق ہے ۔ اسی لئے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۹] التفسیر القیم مرتبہ مولانا محمد ادریس نگرامی ندویؒ

نے فرمایا :-

الا ان فی الجسد لمضغة اذا	سن رکھو کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے
صلحت صلح الجسد کله و	جب وہ سدھر جاتا ہے تو سارا تن بن جاتا ہے
اذا فسدت فسد الجسد کله	اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا
الا و ھی القلب	ہے ۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے !

اسی قلب کو تقوے کا مرکز بھی بتلایا ، اس طرح کہ اپنے دست مبارک سے اپنے قلبِ اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا :

و تقوٰی ھٰھنا	تقوٰی کی جگہ یہ ہے ۔

بہتر سے بہتر ضابطۂ حیات انسان کو انسانِ کامل نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کی تنفیذ میں اندر سے باہر، قلب سے جوارح ، نیّت سے عمل، شعور داخلی سے ثبوت خارجی اور فرد سے اجتماع کی طرف کا اصول نہ برتا جائے ۔ یہی تمام ہادیانِ برحق اور خود ہادیٔ اعظم و خاتم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت و تبلیغ کا اصول رہا اور اسی کی پیروی ہم پر لازم قرار دی گئی ۔

اب آئیے ایک اور حقیقت پر غور کریں ، عالمِ ارواح میں گو ہم قید زمان و مکان سے باہر نہیں تھے مگر وہ زمانِ الٰہی سے الگ ایک زمانِ غیر زمانی اور مکان نا متناہی تھا ، نہ وہاں ، ماضی ، حال ، مستقبل تھا ، نہ یہ تشکیلیں تھیں نہ صورتیں ، عمل مشاہدہ تھا مگر بلا صورت عمل کے ، مکالمہ تھا مگر بلا لسان و صوت کے ، مگر سفرِ حیات کی ناسوتی منزل میں پہنچ کر روح پابند جسم ہو کر اعمال کی صورتوں کے تعیّن پر مجبور ہو گئی جس کو اسلام اعمالِ صالحہ قرار دیتا ہے ۔ وہ بھی اس سے مستغنٰی نہ رہ سکے گو مقصود اصلی ان کی حقیقت یا روح ہی رہی مگر چونکہ اس عالم میں کوئی روح بلا قالب پائی نہیں جا سکتی اس لئے وہ قالب بھی مطلوب رہے ۔ استاذ فلسفہ صوفیٔ صافی بزرگ حضرت مولانا عبد الباری ندوئ فرماتے ہیں:

" بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن ، کم سے زیادہ کیف ، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے ۔ .... جس طرح " انسانِ کامل " کے دو رخ ہیں ، ظاہر و باطن یا قلب و قالب ، اسی طرح " دینِ کامل " کے بھی دو رُخ ہیں ، شریعت و طریقت

اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوّف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوّف نام ہے باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ ارکان کی ایک ظاہری صورت ہے جس کے احکام فقہ میں بیان ہوئے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضورِ قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) قلب و باطن کے اعمال ہیں۔ جس طرح اکل و شرب، روزہ کا ظاہر ہے اسی طرح اس کا باطن (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) ہے، پھر جس طرح مختلف اعمال شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجاتِ اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں[1]

غرض عالم ناسوت میں ہمارا وجود جس طرح روح مع الجسد کا نام ہے اسی طرح یہاں ہمارے اعمال کا اعتبار بھی مخصوص معنویتوں کے ان کے مخصوص اشکال کے ساتھ جمع ہونے ہی میں متصور ہو سکتا ہے۔ اسی نکتہ کو نہ سمجھنے سے مسلمانوں میں اہلِ ظواہر اور اہلِ باطن کے دو گروہ پیدا ہوئے اور دونوں حقیقت سے بیگانہ رہے۔ شیخ الشیوخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"عبادت کی روح محبت و عشق ـــــ یہ سب جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق نہیں پایا جا سکتا، کلّی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی، جس طرح کہ انسان جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں روح (عمل) یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عملِ ظاہری کے ہو۔ کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں، بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عملِ ظاہری کے ہوں، پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ شخص نہیں اور کلّی من

---

[1] تجدیدِ تصوف (مطبوعہ لکھنؤ) صفحات ۴ تا ۶۔

حیث ہو کلی کا وجود ہوتا نہیں، پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی ..... اور اگر کوئی عمل ظاہری کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی تو اسے مدعی وہی صورت کیوں قبول نہیں کرتا جو محبوب نے تجویز کی ہے، جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزۂ محبوب سے اچھی کونسی صورت ہوگی ؟" [1]

ایک اور موقع پر فرمایا:

" اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اِصبروا ، واشکروا ، امر کا صیغہ نہیں ؟ کیا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ سے روزے کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ سے محبتِ الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجبِ نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔"

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشمس ۹)	بے شک جس نے نفس کو صاف کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا، ناکام رہا۔
یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء - ۸۸)	جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے بجز اس کے کہ جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجبِ فلاح اور دوسری میں سلامتیٔ قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے۔" [2]

غرض اس جمع اضداد دنیا میں آکر حیاتِ انسانی کو عام حیاتی سطح سے جو دراصل سطحِ حیوانی ہے ایمانی سطح پر لانے کے لئے جو دراصل سطحِ روحانی ہے یا یوں کہئے آلودہ زندگی کو "حیاتِ

---

[1] وعظ مسمّٰی بہ "روح الارواح" [2] رسالہ "حقیقتِ تصوف" از حضرت تھانوی

طیبّہ" والی منزل میں پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ معلّمِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بیک وقت صورتِ اعمال بھی حاصل کی جائے اور روحِ اعمال بھی جذب کی جائے۔ صورتِ اعمال تو قرآنی و حدیثی صراحتوں اور حضورِ انورؐ کے نمونۂ اعمال سے ملیں گی، جس کا درس ہر عالمِ دین سے مل سکتا ہے۔ البتّہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت منجذب ہو کر منتقل ہوتی آرہی ہے، کسی مستند صحبت یافتہ اور مجاز صحبت بزرگ ہی سے بطریق انجذاب حاصل کی جاسکتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک لاکھ سے زائد دورِ نبویؐ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا شرف "صحابیت" ہی ہے اور اس شرف میں اس طبقہ مقدس کے عالم و عامی، شمشیر زن اور شاعر، صفہ نشین اور صاحبِ خلافت سب برابر ہیں، اسی فیضانِ صحبتِ نبوی نے انہیں 'احسان' کے مرتبہ اعلیٰ تک پہنچایا تھا، ذات حق، اور جنت و دوزخ گویا ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور ان کی وطن اصلی سے مہجوری صرف ضابطہ کی رہ گئی تھی، ظاہر و باطن کی یہ جامعیت خلفائے راشدین کے زمانہ تک برقرار رہی۔ پھر اموی خلفاء نے شریعت کے صرف ظاہری قوانین کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری قرار دے کر تزکیۂ نفس اور صحبت کے ذریعے روحِ اعمالی کی منتقلی کے فریضہ سے دست بردار ہوگئے، اس دور کے آغاز سے ظاہر و باطن میں تفرقہ پڑ گیا۔ ظاہر شریعت کا نام فقہ اور باطن شریعت کا نام بعد کو تصوّف پڑ گیا۔ اموی خلفاء کے اس حال کو دیکھ کر جن حضرات نے باطنی تربیت اور فیضانِ صحبت کا کام سنبھالا وہ پہلے زہاد پھر عباد پھر صوفی کہلائے، اور حقیقت یہ ہے کہ پھر انہی کے ذریعہ ایمانِ محمدی کو دنیائے دارالامتحان میں عملی کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ انہی نے فقیری میں شاہی کی۔ اور بادشاہتیں پاکر فقیرانہ طرزِ حیات کے نمونے پیش کئے، کامیاب زندگی جو عبارت ہے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جامع ظاہر و باطن اسوۂ حسنہ کی پیروی سے، اس کی تحصیل کا طرز قطبِ ربانی محبوبِ صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ یہ بتلاتے ہیں کہ:۔

کُن مع اللہ عزوجل کَانَ لَا	اللہ کے ساتھ اس طرح رہ گویا مخلوق
خلق ومع الخلق کَانَ لَا نفس،	موجود ہی نہیں اور مخلوق کے ساتھ
فاذا کنت مع اللہ عزّوجل	اس طرح رہ گویا نفس موجود ہی نہیں
بلا خلق وجدتہٗ وعن	پس جب تو مخلوق کے بغیر اللہ کے ساتھ

الکل فنیت واذا کنت مع الخلق بلا نفس عدلت و اتقیت وعن التبعات سلمت	ہوگا تو تو اللہ کو پائے گا اور سب سے فنا ہوجائے گا اور جب تو بلانفس کے مخلوق کے ساتھ ہوگا تو تو عدل کرے گا اور حق پر قائم رہے گا اور برے انجام سے محفوظ رہیگا۔
(فتوح الغیب - مقالہ ۷۷)	

اسم بامسمّی حضرت محی الدین الجیلی قدس سرّہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی میں نے نقل کر دی اور آپ نے سن لی مگر فرق یہ ہے کہ یہ عاجز یہ اطلاع پہنچا کر آپ کو اس حال کا صاحب حال نہیں بنا سکا جبکہ حضرت شیخ نے اپنی صحبت اور فیضانِ نظر سے اپنے مخاطبین کو اس مقام تک پہنچا کر "انسانِ کامل" بنا دیا تھا۔ آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہو تو وہ کسی قائد سے نہیں، معقولی سے نہیں، نرے مولوی سے بھی نہیں بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفیٔ صافی کی صحبت بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا، اس کی صحبت سے قلب کو جلاء ملے گی، اس میں نور آئے گا اور پابندِ جسد روح پھر اس نورانی حاسہ سے اَنفُسی حقائق کو "کانك تراہ" پانے لگے گی، پھر یہی شخص ہوا وہوس سے نکل کر صاحب عدل ہوگا۔ اور کوئی دنیوی تحریص اس کو "حق" سے ہٹا نہ سکے گی یہی باکمال انسان ارضی خلافت کا فریضہ انجام دے سکے گا، دنیوی اقتدار اس کو منجانب اللہ ملے گا کیونکہ اللہ پاک سے زیادہ وعدہ کا سچا کوئی نہیں، اور اس کا وعدہ ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء: ۱۰۵)	اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

اور جب اقتدارِ خلافت کی باگ ایسے "کامل انسان" کے ہاتھ میں آئے گی تو دنیا اس خلیفہ کے اندر ہمہ رابنہ تجلیات کا پر تو کھلی آنکھوں سے دیکھے گی، جیسا کہ رازدانِ حقیقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

الخلیفۃ من یمشی شریعۃ النبی فی الناس ولیظہر علی یدہ موعود اللہ لنبیہ ظہورے دارد و بطنے،	خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو لوگوں میں جاری کرے اور اس کے ہاتھ پر خدا کے وہ وعدے جو اس کے نبی کے ساتھ تھے پورے ہوں۔

ظاہرش تمشیت است و باطنش داعیہ الیست قویہ کہ بواسطۂ پیغمبر در دل او متمکن شدہ بلکہ از جذر دلِ او جوشد و اگر ایں داعیہ از دلِ کسے نجوشد او را خلیفۂ خاص نمی تواں گفت[1]

اس کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی۔ ظاہری صورت احکام نبی کا نافذ کرنا ہے اور باطنی صورت وہ قوی داعیہ ہے جو بواسطۂ پیغمبر اس کے دل میں جاگزیں ہو بلکہ دل کی گہرائی سے جوش زن ہوتا ہے۔ جس کے دل سے یہ داعیہ جوش زن نہ ہو، اس کو خلیفۂ خاص نہ کہیں گے۔

یہ ہے اسلام کے روحانی نظام کی اجمالی اطلاع جس کی جسارت محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک و اصرار پر راقم عاجز کو کرنی پڑی، ورنہ جو معلومات اوپر فراہم کی گئیں ان سے حقیقتِ حال کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ روحانی نظام قیل و قال کی چیز نہیں بلکہ یہاں عارف رومیؒ جیسے دیدہ ور کی یہ تاکید ہے سہ

قال را بگذار ، مردِ حال شو ۔ پیش مردے کاملے پامال شو

نظام روحانی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی مستند صحبت یافتہ صاحب مشاہدہ بزرگ کی صحبت اختیار کی جائے، حضرت علی متقی، صاحب کنز العمال بڑے محدث بھی ہیں اور ولیٔ کامل بھی، وہ اپنے دریا بکوزہ رسالہ "تبیین الطرق الی اللہ" کو اس فقرہ پر ختم فرماتے ہیں۔

واما احتیاج الناس الی المرشد والاستاذ فلابد منہ لتحصیل الطریق وسرعۃ الوصول واما سلوک الطریق بغیر المرشد والاستاذ فھو فی الجملہ ممکن لمن وفقہ اللہ بموجب قولہ 'وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا

تحصیل طریقت اور سرعت وصول کے لئے کسی مرشد و استاد کی حاجت ضروری ہے کیونکہ گو فی الجملہ بغیر مرشد و استاد کے بھی جس کو خدا توفیق دے سلوک و طریقت میں کامیابی ہو سکتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ ہمارے لئے ہماری راہ میں کوشش کرتے

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ۔ جلد اوّل فصل سوم

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ' بتعب شديد ومدة طويلة وهو نادرًا جدًا[1]

ہیں یقیناً ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں" مگر یہ بڑے مجاہدے اور مدّتِ دراز کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی بہت ہی شاذ و نادر۔

ظاہر ہے کہ نادر کو کلّیہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی نہ کوئی عاقل قاعدۂ کلّیہ کو چھوڑ کر مستثنیٰ کے درپے ہونا گوارا کرے گا۔ یہاں صحبت ازبس ضروری ہے اور صحبت بھی ایسے کی جس کا سلسلۂ صحبت، صحبتِ نبویؐ تک متصل ہو۔ سب جانتے ہیں کہ سلسلۂ سند کا اہتمام یا تو محدّثین میں ہے یا پھر شیوخِ طریقت میں اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محدثین کرام کو یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ اقوالِ رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) غیر نبی کے اقوال کی ملاوٹ سے پاک رہیں اور شیوخ طریقت کو یہ حزم دامن گیر ہے کہ صحبتِ نبویؐ کے فیوض، برکات اور انوار خود ساختہ مصلحین کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک رہیں۔

اب رہا یہ اشکال کہ جب یہ علم صحبتی علم ہے تو اس موضوع پر اکابر شیوخ کی اتنی کتابیں کیوں ملتی ہیں۔ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ جن اکابر صوفیاء نے یہ کتابیں تصنیف فرمائیں وہ مدارس کے لیے تھیں نہ عام مسلمانوں کے لئے بلکہ وہ صرف طبقۂ سالکین کے لئے تھیں تاکہ دورانِ مجاہدہ و سلوک انہیں جو اشکالات پیش آئیں انمیں انہیں رہبری حاصل رہے یا جو احوال و عبقات یا مشاہدہ و مکاشفات حاصل ہوں ان کی حقیقت کو سمجھ کر تصدیق یا بصورت دیگر تصحیح کی سہولت حاصل رہے۔ ان کتابوں پر اور ان صوفیانہ اصطلاحات پر جو زمانہ بہ زمانہ وضع ہوئیں اور برتی گئیں اصل نظامِ روحانی کا جو نبی امّی فداہ ابی امی کی صحبت بابرکت، فیضانِ نظر اور انفاس قدسیہ سے صحبتِ متواترہ کے ذریعہ ملا ہے، قطعاً دارومدار نہیں، اسی لئے محمد غزالی ہوں یا جلال رومی، فخر رازی ہوں یا برکات احمد

---

[1] یہ رسالہ مخطوطہ شکل میں تھا۔ اس کی اوّلین اشاعت کی سعادت راقم الحروف کے حصّہ میں آئی۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ " البعث الاسلامی " (لکھنؤ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء (غالباً) میں چھپا، پھر اردو ترجمہ کے ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت ماہنامہ " بیّنات " (کراچی) بابت فروری ۱۹۶۴ء میں ہوئی جب اس کی ادارت میرے ہاتھ میں تھی۔

ٹونکی سرِطالب تزکیہ وتصفیۂ باطن کو یہاں اوّلین انتباہ یہی ملتا ہے کہ ؂

صد کتاب و صد ورق در نار کُن　　سینہ را از نورِ حق گلزار کُن

افسوس کہ عہدِ اَلَست اور طریقت کے ناآشنا دانشور، ریسرچ سکالرز، الٰہیات میں عقلی گھوڑے دوڑانے والے فلسفی اور تخیلات کے پتنگ اڑانے والے شاعر اور مستشرقین کے پیروؤں کے ہاتھوں میں صوفیائے کرام کی یہ کتابیں پہنچ کر عجب مضحکہ خیز رائے زنی اور رد وقبول کا شکار ہوگئی ہیں، ان حرف زنوں کی نہ تصدیق معتبر نہ تکذیب معتبر بلکہ آشنائے حقیقت یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہے کہ ؂

تو نہ دیدی گہے سلیماں را　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اللہ تعالیٰ ان " ضلوا واضلوا "[1] کے مصداق مدعیانِ افہام وتفہیم کے فتنہ سے اہلِ اسلام کو بچائے، اور اَلَستی حقائق کے متلاشیوں کو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ آئیں، شیخ اکبرؒ کے سے کسی واقف اسرار کی صحبت میں پہنچائے، اس سے پیشتر کہ وہ مکتوباتِ سی صدی کو سمجھنے کی کوشش کریں شاہ شرف الدین یحییٰ منیر کی سند صحبت رکھنے والے کی خدمت میں بار عطا کرے، اس کے بجائے کہ وہ مکتوباتِ امام ربّانی اور معارف لدنیہ اپنی فہم نارسا سے دیکھیں انہیں مجدد الف ثانی والے صاحبِ فیض کی توجہ کا مورد بنائے۔ اس کے بجائے کہ وہ فیوض الحرمین اور سطعات وہمعات کو سمجھنے کی کوشش کریں انہیں وقت کے کسی ولی اللہ کا فیضانِ نظر بخشے، اس سے پہلے کہ کوئی مولوی صاحب قرآن کے تصورِ تزکیۂ نفس یا تصورِ تقویٰ پر قلم رانی کا تہیہ کریں انہیں شاہ اشرف علی تھانوی جیسے صاحب نظر وخبر کی صحبت میں آکر نورِ نظر اور مشاہدۂ حقیقت حاصل کرنے کی توفیق بخشے تاکہ ان کی خدمات سے ملّتِ اسلامیہ کو قرنِ اوّل والا نفع حاصل ہو،

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

---

[1] ترجمہ: "تحقیق کہ خود بھٹکے اور دوسروں کو گمراہ کیا"۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں جو قیامت کے قریب پیدا ہونے والے بے بصر اہلِ علم اور ان کے خطرے سے بچانے کے لئے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائے تھے۔